

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

مشرق وسطیٰ اور سامراجی سیاست

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق؟

خورشید احمد

ایک نئی اور خوفناک ظلیبی جنگ کے شعلے بڑی تیزی سے عراق کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ جس وقت آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں، امریکہ اور برطانیہ کے لڑاکا طیارے اور میزائل سرزمین عراق پر آگ اور خون کی بارش شروع کر چکے ہوں۔ گو اس کا بھی امکان ہے اور ہماری نگاہ میں غالب امکان یہی ہے کہ وسیع پیمانے پر لام بندی کے بعد ایک بار پھر وقتی طور پر خاک و خون کی یہ ہولی موخر کر دی جائے اور اور بلی اور چوہے کا کھیل اس طرح جاری رہے جس طرح خصوصیت سے پچھلے پچاس برسوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ فضا کی آلودگی میں کوئی کمی نہ ہو، امن و آشتی کا حصول محال رہے، عوام اپنے حقوق سے محروم رہیں، معاشی و مسائل امریکی اور یورپی اقوام کے مفاد میں استعمال ہوتے رہیں، حکمران بدستور عیش و عشرت کرتے رہیں، مسئلہ فلسطین اور بھی الجھ جائے، اسرائیل کی بالادستی محکم تر ہوتی جائے اور امریکہ، معاشی، سیاسی اور عسکری اعتبار سے علاقے کا اصل حکمران رہے۔ جنگ، جنگ کی دھمکی، جنگ کے لیے فضا بنانا اور جنگ سے گریز یہ سب دراصل ذریعہ ہیں نئے نئے عتوانوں سے اپنی گرفت کو علاقے پر مضبوط کرنے اور امت مسلمہ کو اس مرکزی اور تاریخی اہمیت کے علاقے میں حقیقی آزادی اور اس کے دین و ایمان، ثقافت و تہذیب اور عوامی امتگوں کے مطابق ترقی کے مواقع اور ثمرات سے محروم رکھنے کا۔

مشرق وسطیٰ ایک آئینہ ہے جس میں پوری امت کے ایسے کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ امریکہ، مغربی اقوام اور اقوام متحدہ، اسرائیل، عرب دنیا کے حکمران، ترکی کی موجودہ قیادت، عراق کا حکمران ٹولہ اور صدام حسین یہ سب اس ڈرامے کے مختلف کردار ہیں۔ میدان جنگ کے نقشوں کا بننا اور گزرتا اسی کا ایک حصہ

ہیں۔ توسیعی کارروائیاں (sanctions) اور ان میں سہولتیں، دعوے اور دلائل، حقیقی عزائم اور سازشیں، دھمکیاں اور کہہ مکرنیاں، وعدے اور وعدہ خلافیاں ان سب ہی سے اس ڈرامے کے ڈھنگی عبارت ہیں۔ البتہ اس پورے معاملے میں، بد قسمتی سے، جن کا کوئی رول نہیں وہ۔۔۔ مسلمان عوام ہیں۔۔۔ حالانکہ وہی زمین کے اصل وارث اور حق دار ہیں۔ ۱۹۹۱ کی خلیجی جنگ کے بعد ڈرامے کا پلاٹ اور بھی کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ اگر کوئی ابہام تھا تو وہ دور ہو گیا ہے اور جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے وہ اس نقشے کے عین مطابق ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ حالات کا محض سطحی نظر سے جائزہ نہ لیا جائے بلکہ جو حقیقی کھیل کھیلا جا رہا ہے اسے سمجھا جائے اور دشمن کی اصل چالوں کا مقابلہ کرنے کے لیے امت کو بیدار اور تیار کیا جائے۔ عراق کی تازہ صورت حل وہ لمحہ فکریہ فراہم کرتی ہے جسے امت مسلمہ کو ہرگز ضائع نہیں ہونے دینا چاہیے۔

بیسویں صدی میں مشرق وسطیٰ کی قسمت کا فیصلہ جن سامراجی قوتوں کے ہاتھوں میں رہا ان میں اولین برطانیہ اور فرانس تھے، پھر اٹلی نے اپنا حصہ بنایا اور آخر کار امریکہ اور روس نے پنجے گاڑ دیے۔ مگر عالمی طاقت کے طور پر روس کی پسپائی کے بعد، اب امریکہ نقشوں میں رنگ بھرنے اور تصویر بنانے اور بگاڑنے میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔

پہلی جنگ کے اختتام (۱۹۱۸) سے پہلے ہی مشرق وسطیٰ کے نئے سیاسی جغرافیے کا نقشہ (geo-political map) بنا لیا گیا تھا۔ اس کی بنیاد مئی ۱۹۱۶ کے اینگلو فرینچ معاہدے میں طے ہوئی جو سٹینیکس ہس کنٹ معاہدہ (Sykes Picot Agreement) کے نام سے معروف ہے اور جس کے تحت ان دونوں سامراجی طاقتوں نے پورے علاقے کی اپنے درمیان بندر بانٹ کر لی تھی۔ پھر ۱۹۱۷ کے اعلان بالفور کے ذریعے اس میں اسرائیل کے لیے جگہ بنائی گئی۔ ۱۹۲۰ کے معاہدہ سیورز (Treaty of Sevres) کے تحت اگرچہ دولت عثمانیہ کا قصہ ختم کر دیا گیا تھا تاہم ترک مجاہدین کی عظیم جدوجہد نے اناطولیہ پر ترک اقتدار کو بچا لیا۔ پھر خلافت عثمانیہ کی تجبیز و تدفین اور سیکولر نظام کے قیام کی قیمت پر ۱۹۲۳ کے معاہدہ لوسان (Treaty of Lausanne) کے تحت ایک محدود علاقے پر ترک ری پبلک کو تسلیم کیا گیا، مگر اس کے ہاتھ پاؤں کٹ کر!

ٹی ای لارنس جو برطانیہ کا جاسوس اور کارندہ تھا اپنی کتاب ”حکمت کے سات ستون“ (Seven Pillars of Wisdom) میں اس کھیل کے کچھ پہلو بیان کرتا ہے جو دولت عثمانیہ کو تباہ کرنے، عرب قومیت کو ابھارنے اور برطانوی استعمار کے قدم جمانے کے لیے کھیلا گیا۔ عربوں کو ترکوں کے مقابلے میں اٹھایا گیا اور دونوں میں اسلامی قومیت کی جگہ لسانی اور علاقائی قومیت کو فروغ دیا گیا۔ عربوں میں اپنی کامیابی کے بارے

میں لارنس دعویٰ کرتا ہے کہ ”میرا مقصد ایک نئی قوم کی تشکیل تھا“ اس کے کھوئے ہوئے رسوخ کی بحالی (I meant to make a new nation; to restore a lost influence) (کتاب مذکور، مطبوعہ لندن، ۱۹۳۰ء، ص ۲۳) نیز یہ سنرا خواب بھی دکھاتا ہے کہ:

We could see a new factor was needed in the East, some power or race which would outweigh the Turks in numbers, in output and in mental activity. (ص - ۵۶)

ہم نے صاف دیکھ لیا تھا کہ مشرق میں ایک نئے عامل کا وجود ناگزیر ہے۔ ایک ایسی سیاسی طاقت یا نسلی قوت جو ترکوں پر اپنی عددی پوزیشن، پیداوار کی صلاحیت اور فکری حرکت کی بنا پر سبقت لے جاسکے۔

یہ نئی قوت بظاہر موعود عرب ریاست تھی جو کبھی وجود میں نہ آئی اور اس کی جگہ ایک درجن (اور اب ۲۲) عرب مقبوضہ علاقے وجود میں آئے اور ان سب پر مشرقی اقوام کا تسلط قائم کیا گیا اور آخر کار اسرائیل کو علاقے کی سب سے مضبوط اور پالا تر ریاست بنا کر اسے امریکہ اور یورپی اقوام کی عسکری چھتری کا تحفظ عطا کیا گیا۔ ۱۹۱۹ء کے معاہدہ ورسلز (Treaty of Versailles) لیگ آف نیشنز کے ۱۹۲۲ء کے پروٹوکول آف سینڈیٹ سے لے کر ۱۹۲۸ء کی اقوام متحدہ کی تقسیم فلسطین اور قیام اسرائیل کی قرارداد اور اس کے بعد ۱۹۶۷ء اور ۱۹۹۱ء سے لے کر آج تک کی سلامتی کونسل کی قراردادیں اور کیمپ ڈیوڈ سے لے کر اوسلو معاہدے تک، سب دراصل شرق اوسط کو منقسم رکھنے، کمزور رکھنے اور اپنی گرفت میں رکھنے کے دروبست ہیں۔ اس پورے ایسے کی تصنیف و تالیف میں جہاں سامراجی قوتوں کا کردار کلیدی تھا، وہیں علاقے کے اپنے لیڈروں کا کردار بھی کچھ کم فیصلہ کن نہ تھا۔ ذاتی اغراض، خاندانی اقتدار اور دولت کے حصول کے لیے ہر علاقے میں کچھ عناصر نے مغرب کی استعماری قوتوں کے دست و بازو کا کردار ادا کیا اور یہی صورت حال ناموں کی تبدیلی اور عنوانات کے تغیر کے ساتھ اس وقت تک جاری ہے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ایک عرب دانشور حلیم برکت اپنی کتاب 'The Arab World: Society, Culture and State' (مطبوعہ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا پریس، برکلی، لندن ۱۹۹۳ء) میں ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کے بعد کی صورت حال کی یوں منظر کشی کرتا ہے:

خلیج کی جنگ نے عربوں کے اس اعتماد کو متزلزل کر دیا کہ وہ خواب اور حقیقت کے درمیان خلا کو پر کر کے ایک نیا آغاز کر سکتے ہیں۔ اچانک انہوں نے اپنے کو ایک ایسی صورت حال میں پایا جو اس سے مختلف نہ تھی جس کا تجربہ انہیں پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا تھا۔ آزادی اور اتحاد کے ایک نئے دور

کے بجائے وہ مغرب کے غلبے اور مزید فکڑے فکڑے ہونے کی دھمکیوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان کے پر امید خوابوں کی جگہ پریشان کن مذاکرات نے لے لی ہے۔ عرب اپنی شکست اور ناکامیوں کا الزام مغرب پر رکھتے ہیں مگر اپنے آپ کو بھی قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ میں اس دعوے کو دہرانا چاہتا ہوں کہ احساس اجنبیت کی تباہ کن حالت عربوں کی موجودہ مصیبت کی ذمے دار ہے۔ میری بنیادی دلیل یہ ہے کہ عرب شہری بے اختیار کر دیے گئے ہیں کیونکہ انھیں سیاسی عمل سے خارج کر دیا گیا ہے، کنارے لگا دیا گیا ہے اور ان سیاسی اور ملوی وسائل سے علیحدہ کر دیا گیا ہے جو ایک سول سوسائٹی ان کے حوالے کرتی ہے۔ علاقے کے عوام معاشرے پر ریاستی جبر کی مصائب برداشت کر رہے ہیں۔ عرب ریاستیں اور حکمران اپنے معاشرے کے خلاف ایک طاقت بن گئے ہیں، اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عرب عوام اجنبیت کے شدید احساس کا شکار ہیں۔ عربوں کو فیصلوں پر اثر انداز ہونے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ان کا اس میں کوئی دخل نہیں کہ تیل سے حاصل ہونے والی بیش بہا دولت اور ان کی محنت سے پیدا ہونے والے لامحدود وسائل کس طرح کلام میں لائے جائیں۔ سیاسی اقتدار کی طرح معاشی طاقت بھی چند خاندانوں اور قبائلی سرداروں کا استحقاق ہو گئی ہے۔ بیرونی محاذ پر عرب، مغربی صیہونی ہلال دستی کا شکار ہیں۔ اندرونی محاذ پر وہ آزادی اور شرف انسانی سے محروم ہیں (ص ۳۶۹-۳۷۷)۔

یہ حالات کا ایک حقیقت پسندانہ اظہار ہے جو کمزوری کے اصل اسباب اور عوامل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ خود مغرب کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کا تجزیہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ صدر کارٹر کا قومی سلامتی کا مشیر، برزنسکی اپنی تازہ کتاب 'Out of Control' میں عرب دنیا کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے:

کش کش اور عدم استحکام، مشرق وسطیٰ اور جنوبی یوریشیا پر محیط اسلامی علاقوں کی مرکزی اور مستقل حقیقتیں رہنے کا امکان ہے۔ عربوں کا روایتی عدم اتحاد، جسے مغربی طاقتیں جو عربوں کے تیل کی فراہمی پر اپنا کنٹرول رکھنے میں دلچسپی رکھتی ہیں، جن بوجھ کر بددعائی ہیں، مستقل علاقائی عدم استحکام میں اضافہ کرے

گا۔ (Out of Control: Global Turmoil on the Eve of the Twenty-First Century,

by Zbigniew Brzezinski, Simon and Schuster, New York, 1995. (ص ۲۱۳)

مشرق وسطیٰ میں تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد جو خونی ہولی کھیل جا رہی ہے اور جس طرح ایک بحران کے بعد دوسرا بحران اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے اور ایک ملک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو رہا ہے اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس اندرونی تناظر اور بیرونی قوتوں کے سامراجی کھیل کو سمجھا جائے۔ خلیج کی جنگ محض کویت پر عراق کے حملے کا نام نہیں (گو یہ اقدام ہر اعتبار سے قابل مذمت تھا اور ہے) بلکہ اسے اس پس منظر اور پیش منظر میں دیکھنا ضروری ہے جو آج مشرق وسطیٰ کا الیہ بن گیا ہے۔

آج امریکہ اور برطانیہ عراق پر حملے کے لیے ہمانے تلاش کر رہے ہیں اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کو من مانے معافی پستانے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ اگر بصیرت کی نگاہ سے ان تمام حلات کا جائزہ لیا جائے تو یہ سب ایک گھٹاؤ نے ڈرامے کے پلاٹ نظر آتے ہیں۔ ایران میں اسلامی انقلاب، افغانستان میں تحریک جہاد اور فلسطین میں انتفاضہ وہ سنگ ہائے میل ہیں جو امت مسلمہ کے پالعموم اور عرب دنیا کے بالخصوص اسلامی احیاء کی منزل کی طرف پیش رفت کی علامت ہیں۔ لیکن یہی وہ پہلو ہیں جو مغرب کے لیے خطرے کی گھنٹی بن گئے اور سامراجی قوتیں اسلامی احیاء کا راستہ روکنے کے لیے علمی اور عملی ہر سطح پر ایک موثر حکمت عملی سے آراستہ ہو کر میدان میں آگئیں۔ جس صدر صدام حسین کو آج ہٹلر کے روپ میں پیش کیا جا رہا ہے، اسے ہٹلر بنانے کا کام انہی مغربی اقوام نے انجام دیا۔ اسے خطرناک ترین اسلحہ سے مسلح کیا، تمام عرب ممالک نے تیل کی دولت کا ہماؤ اس کی طرف کر دیا اور ایران عراق جنگ کے شعلوں نے مشرق وسطیٰ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس جنگ میں ایران اور عرب ممالک کے سات آٹھ سو ارب ڈالر پھونک دیے گئے اور لاکھوں انسانوں کو لقمہ اجل بنا دیا گیا۔ جب یہ جنگ ختم ہوئی تو امریکہ اور مغربی اقوام نے محسوس کیا کہ عراق کو ایسی عسکری قوت اور بنیادی ڈھانچہ (infrastructure) حاصل ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں علاقے کی قوت کا توازن اسرائیل کے خلاف ہو سکتا ہے۔ چونکہ اسرائیل کا تحفظ اور علاقے میں اس کی بالادستی امریکی اور یورپی اقوام کے پالیسی اہداف میں مرکزی اہمیت رکھتی ہے، اس لیے ایک نئی جنگ کی ضرورت تھی جس کے ذریعے عراق کی اس قوت کو تباہ کیا جاسکے اور عرب ممالک کے پاس جو معاشی دولت ہے اس سے انھیں محروم کیا جاسکے۔ ایک طرف صدام کو کویت پر حملہ کے لیے ہری جھنڈی دکھائی گئی (جس کا ثبوت خود امریکی سفیر کا بیان اور برطانوی سابق وزیر ٹونی بن کی شہادت ہے کہ خود صدام نے اسے بتایا کہ اسے اس کی ترغیب دی گئی) اور دوسری طرف کسی مشورے کے بغیر اور عوام کی شدید نفرت کے باوجود عرب ممالک کی حفاظت کے نام پر امریکہ اور یورپی اقوام کی فوجیں میدان میں اتار دی گئیں۔ جب جنگ ہوئی تو صدام اور اس کی فوج نے جو ایک طرف ”بلور جنگ“ کی باتیں کر رہا تھا اور بروقت کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھا، عملاً جنگ میں کوئی کارنامہ انجام نہ دیا جس کے نتیجے میں لاکھوں انسان لقمہ اجل بنے، فوجی قوت کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا، اسرائیل کو کوئی نقصان نہ پہنچا اور جنگ کا سارا خرچ اور اس کے بعد کی تباہی کی شکل میں سارا خمیازہ عرب ممالک کو بھگتنا پڑا۔ اس کا اندازہ خود عرب مالیاتی فنڈ کی ایک رپورٹ کے مطابق ۷۶۰ بلین ڈالر ہے جو پوری اسلامی دنیا کے بیرونی قرض کی رقم سے دوگنا ہے۔ اس سب کے باوجود صدام حسین اسی طرح برسر اقتدار رہا اور ہے اور رکھا جائے گا تاکہ امریکی فوجیں عرب سرزمین پر ظہج کے سمندروں پر موجود رہیں، اپنی گرفت قدر خدمات کا سودور سود معلوضہ وصول کرتی رہیں، عرب ممالک کے لیے صدام حسین کا ”خطرہ“ بھی موجود رہے

اور وقتاً فوقتاً ایسی جھڑپیں ہوتی رہیں جن کے نتیجے میں امریکہ اور اسرائیل کو اس علاقے میں اپنے منصوبے پورے کرنے کے مواقع حاصل رہیں۔ یہ ایک ایسا سامراجی کھیل ہے جس کے سارے کردار پچشم سردیکھے جاسکتے ہیں لیکن اس کے باوجود عوام کو دھوکہ دینے کے لیے مختلف ٹانگ کیے جا رہے ہیں اور مغربی میڈیا کی پوری قوت ذہنوں کو مسخر کرنے اور اپنے مفید مطلب فضا پیدا کرنے کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔ ۱۹۹۱ کی جنگ کے موقع پر تین سفید جھوٹ اس قوت سے اور اس تسلسل سے پھیلائے گئے کہ تمام ذہن مسموم ہو گئے اور جنگ کی فضا بن گئی۔ بعد میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ ارادی طور پر محض فضا بنانے اور لوگوں کو مجبور کرنے کے لیے یہ جھوٹ وضع کیے گئے یعنی:

(i) عراق سعودی عرب پر حملہ کرنے کے لیے فوج کشی کر رہا ہے۔

(ii) عراق نیوکلیر یاد رہنے والا ہے۔

(iii) عراقی افواج کویت کے اسپتال سے بچوں کو انکیوبیٹرز (incubators) سے نکل کر لے گئیں اور

ہلاک کر ڈالا۔

جنوری ۱۹۹۶ میں برطانیہ کے ٹی وی چینل IV نے The Lies that Made the Gulf War پر ایک دستاویزی فلم بنائی جس میں ان تینوں ارادی اور عمومی جھوٹوں کا پردا چاک کیا اور بتایا کہ کس طرح میڈیا کو جنگ کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ کوئی منفرد واقعہ نہیں، مسلسل یہی کھیل کھیلا جا رہا ہے اور آج بھی اسی طرح جنگی فضا بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، البتہ موضوع بدل گیا ہے۔ آج کیسیاوی اور حیاتیاتی اسلحے کا ڈھونگ رچھایا جا رہا ہے اور دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ عراق اس پوزیشن میں ہے کہ ساری دنیا کے تمام انسانوں کو گیس اور جراثیم کے ذریعہ ختم کر سکتا ہے۔

ہمیں صدام حسین کی ذات اور عراق کی برسرِ اقتدار جماعت سے کوئی ہمدردی نہیں۔ وہ اسی طرح اس ڈرامے کا ایک کردار ہیں جس طرح بہت سے دوسرے۔۔۔ لیکن ہماری دلچسپی امت مسلمہ سے ہے، خواہ وہ عراق کی سرزمین پر ہو، باقی عرب دنیا میں ہو یا کہ ارض میں کسی بھی مقام پر۔ ہم اپنی اس رائے کا اظہار بھی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہمارے پاس مضبوط تاریخی دلائل اور شواہد ہیں کہ گو امریکہ اور اس کی ایجنسیوں نے بارہا بین الاقوامی قانون کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے دوسرے ممالک کی سیاسی قیادت کو ناجائز ذرائع سے اقتدار سے ہٹایا اور ہلاک تک کیا، جیسے ایران میں ڈاکٹر صدق اور چلی میں ڈاکٹر سلوا دورالانوسے، لیکن صدام حسین کو اقتدار سے ہٹانا ان کا ہدف نہ تھا اور نہ ہے۔ یہ اس لیے کہ صدام کے خطرے کی بنیاد پر وہ پوری عرب دنیا کو بلیک میل کر رہے ہیں اور مزید کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا اصل ہدف مشرق وسطیٰ پر اپنا تسلط اور کنٹرول اور اس علاقے پر اسرائیل کی بلا دستی اور علاقے میں کسی ایسی قوت کو نہ

ابھرنے دیتا ہے جو اسرائیل کے لیے خطرہ بن سکتی ہو۔ اس فریم ورک میں صدام حسین اور عراق ان کے لیے بڑا منفید مطلب کردار ادا کر رہے ہیں۔ امریکہ کے مشہور رسالے ہارن افیورڈ کا چیفنگ ایڈیٹر جو نیوز ویک کا معاون ایڈیٹر بھی ہے، نیوز ویک میں اس پورے کھیل کی بڑی چشم کشا تصویر گری کرتا ہے۔ پس منظر ہے ۱۹۸۶ میں صدام کی افواج کا عراق کے کرد علاقے میں اقدام جسے امریکہ اور اقوام متحدہ نے محفوظ علاقہ قرار دیا ہوا ہے اور جس میں امریکہ ایک کرد پارٹی کی دوسروں کے مقابلے میں پشت پناہی کرتا رہا ہے۔

ملاحظہ ہو:

امریکہ اور صدام حسین کے درمیان تازہ ترین محرکے نے امریکہ کو ایک دفعہ پھر یاد دہانی کرائی ہے کہ صدام ابھی زندہ ہے اور صاحب اقتدار ہے۔ کہا جاتا ہے اس سے خبیثی جنگ کے نامحل اختتام اور مشرق وسطیٰ میں امریکی ڈپلومیسی کی ناکامی واضح ہوتی ہے۔ کوئی بات بھی سچائی سے اتنی دور نہیں ہو سکتی۔ اگر صدام حسین موجود نہ ہوتا تو ہمیں اسے ایجاد کرنا پڑتا۔ وہ مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی کا محور ہے۔ اس کے بغیر واشنگٹن صحرا کی ریت میں ٹانگ ٹوئیاں مار رہا ہوتا۔

خلیج فارس صنعتی دنیا کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون، یعنی تیل کے وسیع ذخائر سے ملامل ہے۔ یہ علاقہ امریکہ کے لیے غیر معمولی مفادات کا حامل ہے اور امریکہ سے تعلقات کی ایک تاریخ رکھتا ہے۔ توازن اقتدار کی سادہ سیاست کا تقاضا ہے کہ علاقے میں کسی دشمن ریاست کا غلبہ نہ ہو۔ امریکہ نے چالیس سال سے زائد مدت سے ایسی پالیسی برقرار رکھی ہے، واشنگٹن کی علاقے میں بین عرب ازم کی آڑ میں ۱۹۵۰ میں مصر کی بالادستی کی مخالفت سے لے کر ۱۹۹۱ میں عراق پر حملے کی معکوس پالیسی تک۔

امریکہ کو علاقے کے توازن کے لیے ایک طویل البعاد پالیسی برقرار رکھنے کی ضرورت ہے، اس لیے اسے بیرونی دنیا میں حلیفوں کی ضرورت ہے اور ملک میں عوامی حمایت کی بھی۔ صدام حسین کی موجودگی دونوں میں بے حد مدد دیتی ہے۔ اگر صدام نہ ہوتا تو سعودی شاہی خاندان جو امریکہ کی زیر تحفظ ریاست ہے (جیسا کہ وہ ایک لحاظ سے اس وقت ہے) خوفزدہ ہو کر امریکی افواج کو اپنی زمین پر آنے کی اجازت دیتا؟ کیا کویت تیس ہزار سے زائد امریکی جہاز، ٹینک اور دیگر اسلحہ اپنے ہاں رکھتا کہ شاید ضرورت پڑ جائے؟ کیا اردن کے بادشاہ جو علاقے کے سیاسی بلوٹا ہیں امریکی میرین دستوں کو اپنے ملک کی حدود میں مشقیں کرنے کی اجازت دیتے؟ (نیوز ویک، ۱۹ ستمبر ۱۹۹۶، ص ۱۷)

صدر فورڈ اور صدر بش کے قومی سلامتی کے مشیر برنٹ اسکو کرافٹ نے بھی اپنے انداز میں صدام کی افلات، ضرورت نیز اسے نہ ہانے کی امریکی پالیسی کا اعتراف کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو نیوز ویک، ۲۳ ستمبر ۹۶، ص ۱۹)

اس کھیل کو جاری رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً ہنگاموں، تصادم کے ڈراموں، فوجی نقل و حرکت اور حسب

ضرورت جنگ اور انسانوں کی ہلاکت کی ضرورت ہے اور یہ کھیل پوری بے دردی کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے۔ نیز ان خدمات کا معروضہ بھی پوری ہوشیاری سے وصول کیا جا رہا ہے اور صرف عرب حکومتوں ہی سے نہیں غریب عراقی عوام سے بھی وصول کیا جا رہا ہے۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے ۱۹۹۱ میں کس قوت کے ساتھ عراق پر حملہ کیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اس آپریشن میں تین ہزار سے زیادہ لڑاکا طیاروں نے حصہ لیا اور ۵ لاکھ کی فوج ظفر موج میدان میں لائی گئی۔ امریکہ نے اپنی کل عالمی فضائی قوت کا ۷۰ فی صد اور کل ٹینک قوت کا ۳۰ فی صد عراق کی ”چڑیا“ کو مارنے کے لیے استعمال کیا۔ امریکہ نے ویت نام میں ساڑھے آٹھ سال میں ۶۸ ہزار ٹن بم گرائے جبکہ عراق کے خلاف ۳۳ دن میں ایک لاکھ چھ ہزار ٹن — اور اس طرح عراق کو ایک مقبوضہ ملک بنا ڈالا۔ خلیجی جنگ کے بعد سے اب تک عراق کے ۳ لاکھ افراد جنگ یا جنگ کے بعد کے حالات کی وجہ سے جن میں تلویجی کارروائیاں (sanctions) شامل ہیں، ہلاک ہو چکے ہیں۔ ۵ سال سے کم عمر کے بچے جن کی وفات کی شرح ۱۹۹۱ سے پہلے ۵ سو فی مینڈ تھی اب ۶ ہزار ۵ سو فی مینڈ ہے اور ۵ سال سے بڑے بچوں کی موت کی شرح ۱۶ سو ماہانہ سے بڑھ کر ۱۸ ہزار ماہانہ ہو گئی ہے۔ اگر یہ مسلسل نسل کشی (genocide) نہیں تو اور کیا ہے؟

عراق کے اسلحے کے خفیہ ٹھکانوں کی دریافت بھی ایک ہوش ربا ایکنڈل ہے۔ اس تلاش کو اب ساتواں سال ہے۔ ساڑھے چار سو سے زیادہ انسپکٹرز اس کام پر مامور ہیں (دانشع رہے کہ عراق نے ان ۳۵۰ میں سے صرف ۳۱ کو امریکہ اور برطانیہ کا چاسوس ہونے کے الزام میں نکل جانے کے لیے کہا تھا اور پھر ہوائی تلویجی حملوں کی دھمکی کے بعد دوبارہ کام شروع کرنے دیا)۔ ساتواں سال ہے اور یہ انسپکٹرز اپنا کام مکمل نہیں کر پائے۔ اس عرصے میں یہ عراق کی نیوکلیئر استعداد کو ختم کر چکے ہیں، ۳۶ ہزار کیمیکل بم اور آڈنٹوری شیل، ۶۹۰ ٹن کیمیکل ایجنٹ اور ۸۹ میں سے ۸۱ اسکڈ میزائل جاہ کر چکے ہیں۔ مختلف صنعتی پلانٹوں کی مکمل تباہی اس کے علاوہ ہے۔ ایک انسپکٹرز نے اس ادارے یعنی United Nations Special Commission on Iraq (UNSCCI) کے بارے میں صبح اعتراف کیا ہے کہ اس کے ذریعے ہم عراق پر فاصلاتی کنٹرول (remote control) سے قبضہ کیے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک ملک کب تک اس طرح کے قبضے کو برداشت کر سکتا ہے؟

یہاں اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ امریکہ کس طرح اس معاملے میں بھی دوغلے معیار پر کاربند ہے۔ عراق کو اس کمیشن پر اس کے لائق کردار کے علاوہ دو اعتراض ہیں۔ ایک یہ کہ یہ انسپکٹرز عراق کی سیاسی حاکمیت اور اس کے حکمرانوں کی عزت و وقار کو بھی پاؤں میں روندنے پر مصر ہیں اور اس بے عزتی کی کوئی حد نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ان انسپکٹرز میں اکثریت امریکہ اور برطانیہ کے لوگوں کی ہے جن

کی عراق دشمنی ایک کھلی حقیقت ہے اور جن سے کسی غیر جانب دار تحقیق کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اصولاً دونوں اعتراضات قتل لحاظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ فرانس، روس اور چین نے ان کو ذہنی اعتراض قرار دیا ہے اور کیمیشن کے سربراہ کے غیر ذمہ دارانہ بیانات پر، جن میں یہ بھی شامل ہے کہ عراق چاہے تو تل ابیب کو کیمیکل بم سے اڑا سکتا ہے، اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ خود اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوئی عنان نے اس پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ لیکن امریکہ مصر ہے کہ وہ بیک وقت پولیس مین، وکیل اور جج کا کردار ادا کرے گا۔ لیکن امریکہ کے دو غلطے پن کا پردا اس قانون نے چاک کر دیا ہے جو ابھی امریکی سینیٹ نے منظور کیا ہے۔ امریکہ نے کیمیاوی ہتھیاروں کی کنونشن (CWC) پر دستخط کر دیے ہیں (پاکستان نے بھی کسی قومی بحث و گفتگو اور پارلیمنٹ اور قوم کو اجھو میں لیے بغیر اس پر دستخط کر دیے ہیں)۔ اس کنونشن کی رو سے عالمی ادارے کے انسپکٹرز شکایت ملنے پر دو ہفتے کے اندر اندر متعلقہ مقلات کا معائنہ کر سکتے ہیں۔ لیکن امریکہ کا رویہ یہ ہے کہ اس کنونشن کی سینیٹ کی طرف سے توثیق کے بعد بیس مواقع پر معائنہ کی جو کوشش ہوئی ہے اس میں دو انسپکٹرز کو امریکہ نے معائنہ نہیں کرنے دیا حالانکہ ان کا تعلق ہیک کی بین الاقوامی تنظیم Organisation for the Prohibition of Chemical Weapons سے تھا۔ اعتراض یہ تھا کہ ان میں سے ایک انسپکٹر کا تعلق ایران سے تھا اور دوسرے کا کیوبا سے۔ اگر امریکہ کو یہ اختیار ہے کہ عالمی ادارے کے انسپکٹرز کو ویٹو کر دے تو عراق یا کسی دوسرے ملک کو یہ اختیار کیوں حاصل نہ ہو۔

اس سے بھی بڑھ کر قتل اعتراض، زیر منظوری قانون کی دفعہ ۳۰۷ ہے جس کی رو سے امریکہ اپنے لیے یہ اختیار حاصل کرنا چاہتا ہے کہ امریکہ اپنی قومی سلامتی کے نام پر جس جگہ کے معائنہ کو روکنا چاہے، روک دے۔ قانون یہ اختیار امریکہ کے صدر کو دے رہا ہے اور یہ بھی قانون میں لکھا جا رہا ہے کہ اس قانون کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ متعلقہ دفعات یہ ہیں:

صدر، امریکہ میں کسی سولت کے معائنے کی درخواست کو مسترد کر سکتا ہے، اگر صدر یہ فیصلہ کرے کہ یہ معائنہ امریکہ کے قومی سلامتی کے مقلات کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔

ایک دوسری دفعہ میں یہ لکھا گیا ہے:

انسپکٹرز کی حیثیت سے کام کرنے والے کسی فرد پر صدر کا اعتراض کسی عدالت میں زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔

روزنامہ گارڈین نے لوآرتی تبصرہ کرتے ہوئے اسے معائنہ کے دو غلطے معیار (double standards for inspection) قرار دیا ہے اور صاف الفاظ میں کہا ہے کہ صرف صدام حسین ہی قاعدہ قانون سے نہیں کھیل رہا، امریکہ بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ (Saddam Hussain is not the only one

stretching the rules)

اس دوغلے پن کے ساتھ کون امریکہ کی اخلاقی پوزیشن کا دفاع کر سکتا ہے؟
تمہاری زلف میں پچی تو حسن کلماتی
وہ تیرگی جو مرے نامہ سیاہ میں ہے

ایک بڑا بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ، برطانیہ یا کسی اور ملک کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اقوام متحدہ کے نام پر جب چاہے عراق پر چڑھ دوڑے۔ یہ کھیل سات سل سے جاری ہے لیکن اب اس جارحیت کا پردا چاک ہو چکا ہے۔ سلامتی کونسل کی قرارداد ۶۸۷ میں اسلحے کے ذخیروں کے معائنہ کا ذکر ہے لیکن اس سلسلے میں قوت کے استعمال کی کوئی اجازت موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ اس سلسلے میں نئی قرارداد لانا چاہتا ہے مگر امریکہ تیار نہیں کہ کہیں روس، چین یا فرانس اسے ویٹو نہ کر دیں۔ یہ صاف اعتراف ہے اس امر کا کہ معائنہ کے مسئلے پر قوت کا استعمال بلا قانونی یا اخلاقی جواز ہے۔ اس مسئلے کے بارے سلامتی کونسل کے مستقل ارکان کے درمیان بھی اتفاق نہیں۔ باقی دنیا بھی اس کی مخالف ہے۔ لیکن امریکہ اپنی من مانی کرنے پر تیار ہوا ہے اور پوری عالمی برادری کے اعتراض کو پرکھ کے برابر بھی وقعت نہیں دے رہا اور ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ صدر کلنٹن نے کئی بار کہا ہے اور اپنے اس سال کے State of the Nation خطاب میں بھی اس کا اعلان کیا ہے کہ ”اگر صدام عالمی برادری کی متفقہ رائے پر نہیں چلتا تو ہم اس کو سزا دینے کے لیے تیار ہیں اور ہم یہ کر کے رہیں گے“۔ اس مسئلے پر امریکہ اور برطانیہ کے علاوہ سارے ملک قوت کے استعمال کے خلاف ہیں۔ روس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر امریکہ ایک طرفہ کارروائی کرتا ہے تو تیسری جنگ عظیم کا خطرہ مول لے گا۔ روس کی پارلیمنٹ (ڈوما) نے باقاعدہ قرارداد منظور کی ہے۔ نیز صدر بوردس یلسن نے اٹلی کے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

تاریخ بتاتی ہے کہ عالمی ہلاکتی قائم کرنے کی کوششیں بیٹھ مختصر المیلا ہوتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ پرانی عادتوں کے خلاف کام آسان نہیں ہوتا، مگر مجھے یہ کہنا ہے کہ بعض ممالک کی یہ کوشش کہ دنیا پر ایک قطبی ماڈل (unipolar model) مسلط کیا جائے اور دنیا کا قائد بن جایا جائے، غیر حقیقت پسندانہ بلکہ خطرناک ہے۔ (دی گلوبل جین، ۹ فروری ۱۹۹۸، ص ۱۱)

عرب لیگ ۲۲ عرب ممالک کی ترجمان ہے، اس کے سیکرٹری جنرل نے نہ صرف یہ کہ فوجی اقدام کی مخالفت کی ہے بلکہ اسے امریکہ کی ضد اور ہٹ دھرمی قرار دیا ہے۔ انگلستان کے بیشتر قومی اخبارات نے برطانوی حکومت کی پالیسی پر تنقید کی ہے اور اسے امریکہ کے آگے ہتھیار ڈالنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ ۱۹۹۱ کی خلیجی جنگ کے امریکی اور برطانوی جرنیلوں نے اسے خطرناک اور غیر مفید (unproductive) قرار

دیا ہے اور کہا ہے کہ بجز معصوم انسانوں کے خون بہانے کے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ امریکہ کے عسکری اہداف کو مبہم اور "Fuzzy Symbolism" (دی انڈی پنڈنٹ، ۱۳ فروری ۱۹۸۰) قرار دیا ہے۔ دانش ور اسے خالص سامراجی کھیل قرار دے رہے ہیں۔ اوسب اور دانش ور ہیرالڈ پینٹر (Harold Pinter) اور کارڈی فل پائل ہیوم نے سخت الفاظ میں تنقید کی ہے۔ پینٹر کے الفاظ نقل کرنے کے لائق ہیں:

امریکہ ایک عفریت بن گیا ہے۔ درحقیقت ضرورت یہ ہے کہ امریکہ کو روک دیا جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ بہت ہولناک ہے لیکن جو بات ہم نظر انداز کر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسے اب غیر حقیقی اور خیالی بنا دیا گیا ہے اور اس حد تک غیر مضربنا دیا گیا ہے (it has been abstracted now and sanitized to such an extent) کہ مسٹر کلنٹن نے بچوں کو قتل کیا ہے اور انہیں اس کی بالکل پروا بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ بھی درحقیقت غیر حقیقی اور خیالی ہیں! یہ بچے وہ ہیں جو ان کی لگائی ہوئی پابندیوں کی وجہ سے مر رہے ہیں۔ بین الاقوامی برادری کی ایک جتنی کے مسلسل حوالے دیے جاتے ہیں لیکن یہ امریکہ ہے جو اتنی طویل مدت سے بین الاقوامی قانون کی تحقیر کر رہا ہے (held in contempt) کہ وہ اس تصور ہی کو بے معنی کر دینے میں کامیاب ہے۔ امریکہ اب ایک ایسا بے مغز عفریت ہے جو قابو سے باہر ہے۔ (دی انڈی پنڈنٹ، ۱۳ فروری ۱۹۸۰)

درجنوں اہل قلم اور سیاسی مبصرین امریکہ کے اس خونخوئی کھیل کی مذمت کر رہے ہیں اور انسانیت کے ضمیر کو اس کے خلاف بغلوت کی دعوت دے رہے ہیں۔

عراق پر اس چڑھائی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اسے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں کی تنفیذ کے نام پر کیا جا رہا ہے، گو ان قراردادوں میں قوت کے استعمال کی اجازت کا کہیں ذکر نہیں۔ لیکن اگر اسے نظر انداز بھی کر دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا سلامتی کونسل کی قراردادوں کا تعلق صرف عراق سے ہے؟ کیا اسرائیل کے بارے میں جو قراردادیں ہیں وہ صرف تبرک کے لیے ہیں اور ان کی تنفیذ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسرائیل ایک نہیں کئی درجن قراردادوں کی پوری ڈھٹائی کے ساتھ کھلی کھلی خلاف ورزی کر رہا ہے اور امریکہ اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ کیا سلامتی کونسل کی قرارداد ۲۴۲ قتل تنفیذ نہیں؟ کیا سلامتی کونسل نے چالیس سے زیادہ قراردادیں فلسطین میں غیر قانونی آباد کاریوں (settlements) کے بارے میں منظور نہیں کیں؟ ان پر عمل کیوں نہیں ہو رہا؟ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ ۱۹۹۷ میں جنرل اسمبلی نے تین بار اسرائیل کے بیت المقدس میں نئے مکانات تعمیر کرنے کے خلاف صرف ایک ووٹ کی مخالفت سے (یعنی اسرائیل کا واحد ووٹ، امریکہ بھی ان قراردادوں کے بارے میں غیر جانبدار رہا) گویا تقریباً متفقہ طور پر یہ قراردادیں منظور کیں لیکن اسرائیل نے ان پر عمل کرنے سے بڑے حقارت آمیز انداز میں انکار کر دیا۔ کوئی

نہیں جو اسرائیل سے ان قراردادوں پر عمل کرائے۔ کیا بھارت کشمیر کے بارے میں سلامتی کونسل کی تین واضح قراردادوں کی کھلی خلاف ورزی نہیں کر رہا؟ کیا بوسنیا میں اقوام متحدہ کے محفوظ علاقے مقرر کیے جانے کے بعد سربوں پر اس کی قراردادوں کو نافذ کیا گیا؟ کیا آج بھی جنگی قیدیوں کے بارے میں سلامتی کونسل کی قراردادوں پر امریکہ اور نیٹو کی فوج کی موجودگی میں کوئی عمل ہو رہا ہے؟ کیا اقوام متحدہ کی قراردادیں صرف عراق ہی کے لیے ہیں؟ آخر اس کھلے کھلے دوغلے پن کے بعد امریکہ کے موقف میں کیا اخلاقی یا قانونی وزن باقی رہتا ہے۔ لندن کے اخبار آبزورڈ نے ادارتی تبصرے میں صحیح کہا ہے کہ: ”اس میں یہ مضمر ہو گا کہ اسرائیل بھی اقوام متحدہ کی قراردادوں کی تعمیل کرے۔“

مصر کے مشہور اخبار الاہرام نے بھی اس حقیقت کو بہت صاف الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

علاقے میں موجود کش مکش کا الزام عراق پر نہیں اسرائیل پر رکھا جانا چاہیے۔ ہر دفعہ جب امریکہ عراق پر چڑھ دوڑتا ہے، اور اسرائیل کے، جس نے عرب ریاستوں پر قبضہ کر رکھا ہے، کیمیائی اور حیاتیاتی اسلحہ کو نظر انداز کرتا ہے، اس کا دوہرا معیار کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اگر امریکہ نے عراق کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا تو علاقے میں امریکہ کی جو کچھ ساکھ رہ گئی ہے وہ اسے بھی کھودے گا۔

(بحوالہ مڈل ایسٹ انٹرنیشنل، لندن ۳۳ فروری ۹۸، ص ۵)

حقیقت صرف یہی نہیں ہے کہ اسرائیل کے بارے میں امریکہ خاموش ہے بلکہ یہ سارا کھیل اسرائیل ہی کو علاقے کی بالاترین قوت بنانے کے لیے کھیلا جا رہا ہے۔ گذشتہ ۲۰ سال سے امریکہ ہر سال اسرائیل کو ۱.۲ بلین ڈالر معاشی امداد (قرض نہیں، صاف صاف امداد) اور ۱.۸ ارب ڈالر فوجی امداد دے رہا ہے یعنی ۳ بلین ڈالر۔ یہ اس وقت ہے کہ جب ساری دنیا کے غریب ملکوں کی بیرونی امداد بند ہو گئی ہے یا سوڈی قرضوں میں تبدیلی کر دی گئی ہے حالانکہ اسرائیل علاقے کے امیر ترین ممالک میں سے ہے اور اس کی سلانہ قومی آمدنی ان ۲۰ سالوں میں ۲۰ ارب ڈالر سے بڑھ کر ۹۸ ارب ڈالر سلانہ ہو گئی ہے جس کا ۲۰ فی صد وہ جنگی تیاریوں پر خرچ کر رہا ہے۔ آئندہ سال کے لیے امریکہ نے وعدہ کیا ہے کہ اسرائیل کی سلانہ فوجی امداد ۱.۸ ارب ڈالر سے بڑھا کر ۲.۳ ارب ڈالر کر دی جائے گی۔

ایک طرف اسرائیل پر یہ عنایات ہیں اور دوسری طرف اسرائیل کا یہ حال ہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں ہی کی دھجیاں نہیں بکھیر رہا، خود اوسلو معاہدہ میں جو وعدے امریکہ سے کیے ہیں ان کا کم سے کم حصہ بھی پورا کرنے کو تیار نہیں ہے۔ معاہدے کے مطابق اب تک دریائے اردن کے مغربی حصے کا ۳۰ فی صد فلسطینی مقتدرہ کو مل جانا چاہیے تھا لیکن عملاً صرف اڑھائی فی صد حصہ ملا ہے اور مزید دینے پر اسرائیل تیار نہیں۔ اس کے خلاف کسی تادیبی کارروائی کی کوئی بات بھی کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس کی ہر ہٹ دھرمی کے جواب میں امریکہ ہی یقین دہانی کرا رہا ہے کہ ہم تمہاری پشت پر ہیں۔

یہ ہے عالمی طاقتوں کا کردار مگر عرب دنیا اور مسلمان امت کی قیادت کا حال یہ ہے کہ اب بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلیں اور وہ امریکہ ہی سے اپنی ساری امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔

حالات کے اس جائزے سے سامراجی قوتوں کے اصل کھیل کے خدوخل بانگل واضح ہو جاتے ہیں۔ ان سے کسی خیر کی توقع رکھنا عبث ہے۔ سوال یہ ہے کہ امت مسلمہ کو اس صورت حال کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہیے؟ کیا ان قوتوں کے آگے ہتھیار ڈال دیں؟ کیا اپنے ایمان اور زندگی کے مقاصد کو قربان یا فراموش کر دیں؟ اور نئی غلامی کی ان زنجیروں کو بہ رضا و رغبت پن لیں؟ یا جس طرح ماضی میں باطل قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے، آج بھی اسی طرح ایک بار پھر صف آرا ہو جائیں اور اللہ کے بھروسے پر اپنے ایمان، اپنے دین، اپنی عزت اور اپنے مستقبل کی خاطر ہر محاذ پر اور بالآخر عالمی سطح پر، انتقام کاراستہ اختیار کریں۔

جوئے خون سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے

آستان یار سے اٹھ جائیں کیا؟

آزادی، زندگی اور عزت کا یہی ایک راستہ ہے اور تاریخ کا فیصلہ ہے کہ کمزور اور مغلوب ہمیشہ اس طریقے پر عمل پیرا ہو کر ظالموں کے چنگل سے نکلے ہیں اور تاریخ کا رخ بدل گیا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کوئی سوپر پاور ہمیشہ کے لیے سوپر پاور نہیں رہ سکتی۔ ہر ایک کے اقتدار کے دن محدود ہیں۔ تاریخ کم از کم ۲۶ سوپر پاورز کا قبرستان ہے اور کم از کم دو عالمی قوتوں (برطانیہ اور روس) کو تو ہم نے اپنی زندگی میں سوپر پاور سے گر کر بے بل و پر ہوتے دیکھا ہے۔ ضرورت اپنے مقاصد کے صحیح تعین اور ان کے لیے صبر آزما جدوجہد کی صحیح منصوبہ بندی کی ہے۔ برزنسکی عالم اسلام میں امریکہ کے مستقبل کے رول کے بارے میں کہنے پر مجبور ہوا کہ:

تاہم اس غلبے کے نہایت سطحی رہنے بلکہ بکھر جانے کا امکان ہے اس لیے کہ امریکہ اور اس کی حاشیہ نشین عرب ریاستوں کے درمیان مشترک اقدار، سیاسی کلچر یا مذہب کے کوئی دریا بندھن نہیں ہیں۔ امریکی اقتدار بیشتر مقامی حکومتوں سے ہلیفانہ تعلق پر مبنی ہے جو اکثر بد عنوان اور بد نما (obscenely) دولت مند طبقے کی ہیں اور خود اپنے ہی عوام سے ان کا رابطہ ٹوٹ جانے کا اندیشہ روز افزوں ہے۔ ایسی صورت میں کہ مذہب اور قومیت دونوں ایک اجنبی طاقت کی علاقائی بالادستی کے خلاف ایک ہیں، مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی موجودہ بالادستی کی تعمیر، لفظ کے حقیقی مفہوم میں، بالکل رست پر ہے۔ اگر عرب اسرائیل تنازعے کو حل کرنے کی امریکی کوششیں ناکام ثابت ہوں تو امریکہ کے لیے عربوں کی مخالفت کا بڑھتا بھی یقینی ہے۔ اسرائیل کے لیے امریکی حمایت کو امریکہ کے اپنے مفادات اور یہودی عوام کے ساتھ اپنی اخلاقی ذمہ داری کا آئینہ دار سمجھا جاسکتا ہے، لیکن یک طرفہ امریکی جھکاؤ کی صورت

میں، عرب اسرائیل بتازع کے پرامن اختتام کی کوششوں میں ناکامی سے امریکہ کی مسلسل علاقائی
 بلا دستی کے خلاف مذہبی بنیاد پرستی اور قوم پرستانہ انتہا پسندی کے مضبوط ہونے کا امکان ہے۔
 (Out of Control، ص ۱۲۳-۱۲۴)

امت مسلمہ کے لیے نجات کا واحد راستہ اپنے گھر کی اصلاح اور درستی میں ہے۔ اللہ پر ایمان اور
 بھروسہ، عوام کی بیداری، ان کے حقوق کے تحفظ کی جنگ اور سامراجی غلبے اور آمرانہ نظام حکومت کے
 خلاف عوامی انتفاضہ وہ ہتھیار ہیں جن سے بڑی بڑی جابر قوتوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مسئلہ، ایک عراق پر
 امریکی پوزیشن کا نہیں، پوری اسلامی دنیا پر سامراجی تسلط کا ہے اور اس میں صرف باہر کی قوتیں کار فرما نہیں،
 اندر کے لوگ بھی شریک ہیں۔ یہ ایک وقت دونوں کا مقابلہ ہی ہماری آزادی اور دین و ایمان کا ضامن ہو سکتا
 ہے۔ اس لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ اصل خطرات کا صحیح ادراک کیا جائے، اس کھیل کے تمام اداکاروں کو
 پہچانا جائے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ایمان کی قوت کی آبیاری، عوامی قوت کی
 تنظیم اور مسلسل جدوجہد کی منصوبہ بندی کی جائے اور فوری نتائج کے خواب دیکھنے کے بجائے زندگی کے ہر
 محاذ پر ٹھوس اور دیرپا جہاد کا راستہ اختیار کیا جائے۔ بلاشبہ مسلمان عوام کو امریکہ اور مغربی اقوام کی اس یلغار
 پر احتجاج بھی کرنا چاہیے اور اپنی حکومتوں کو شرم دلانی چاہیے کہ وہ ان حالات میں محض خاموش تماشاخی نہ
 بنے رہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ مغرب کے کچھ دانش ور، ادیب اور سیاست دان تو امریکہ کے خلاف
 احتجاج کی آواز اٹھا رہے ہیں لیکن مسلم ممالک کی تنظیم (او آئی سی) خواب غفلت میں گمن ہے۔ مسلمان اور
 عرب حکمرانوں میں سے کچھ صرف دہلی زبان سے معذرت خواہانہ انداز میں کچھ کلمات ادا فرما رہے ہیں جبکہ
 کچھ دوسروں کا صلہ یہ ہے کہ۔

پہلے تو آ کے شیخ نے دیکھا ادھر ادھر

پھر سر جھکا کے داخل سے خانہ ہو گیا!

احتجاج اور احتساب وقت کی اولین ضرورت ہیں لیکن حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اصل
 جواب عوامی بیداری اور حق کے لیے جہاد اور انتفاضہ ہے اور اس کے لیے کمر بستہ ہونا وقت کی سب سے
 بڑی ضرورت ہے۔

یا مرہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
 جو قلف لکھا نہ گیا خونِ جگر سے